چودہ اگست

علیم الحق حقی

اختلاف رائے بُری بات نہیں۔ اپنے اپنے نکتۂ نظر کا اظہار ہر ایک کا حق ہے لیکن کسی اختلاف کو آن کا مسئلہ بنا لینا قابلِ تعریف نہیں ہو سکتا کیونکہ چھوٹے چھوٹے اختلافات بعض اوقات سنگین تنازعات کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یہ تنازعے اگر فائدہ مند ہو سکتے ہیں تو صرف ناپسندیدہ بیرونی عناصر کے لیے۔ اس علاقے کے لوگ بھی اختلاف کا شکار ہو گئے تھے۔ یوم آزادی پر وہ جشن کی روایتی تقریبات میں پودا لگانا بھی شامل تھا لیکن پودا لگانے والے کا انتخاب نے انہیں دو دھڑوں میں تقسیم کر دیا۔ تقریب کا دن جوں جوں قریب آ رہا تھا، صورتِ حال کشیدہ ہوتی جا رہی تھی۔

اکمل خان اُس صبح بیدار ہوا تو بہت خوش تھا۔ پہلے تو اُس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہے پھر اسے یاد آیا کہ آج ۱۴ اگست ہے۔ اس نے لیٹے لیٹے ایک طویل انگڑائی لی اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کھڑکی اتنی نیچی تھی کہ اٹھ کر بیٹھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

کھڑکی کے چھوٹے پٹوں سے اُسے کھیت نظر آیا اور سیب کا درخت نظر آیا، جس کے پتوں پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ پھر جھکا آسمان نظر آیا جو ابھی نیلا نہیں ہوا تھا لیکن آسمان پر بادل نہیں تھے۔

اُس کی بیوی خیالو ابھی سوئی ہوئی تھی۔ اُس کے بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ بچے بھی سو رہے تھے۔ اکمل خان نے ہاتھ بڑھا کر نیچے فرش پر رکھی گھڑی اٹھائی اور اس کے الارم کو بجنے سے پہلے بند کر دیا۔ پھر وہ آہستگی سے پلنگ سے اترا اور غسل خانے میں چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ غسل خانے سے دبے پاؤں نکلا۔ وہ بیوی اور

بچوں کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کے لیے وہ ایک طویل دن تھا۔

اُس نے کچن میں جا کر رات کی بچی ہوئی روٹی نکالی' اس پر تھوڑا سا مکھن رکھا اور ایک پیالے میں دودھ نکال لیا۔ روٹی کو دودھ کے سہارے نگلتے ہوئے اس نے سوچا کہ بعد میں آکر ناشتا کر لے گا۔ باہر آکر اس نے گایوں کا دودھ دوہا۔ گایوں کا وہ اس حد تک عادی تھا کہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ گائیں اپنے معمولات کی کس قدر عادی ہوتی ہیں۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ عید' بقر عید ہے یا ۱۴ اگست۔ وہ اتنی ہی توجہ چاہتی ہیں' جو انہیں روز ملتی ہے۔ اسے اس بات کی پروا بھی نہیں ہوئی کہ ہر روز کی طرح اس کی اس صبح کا آغاز بھی چرائی سے ہوا ہے۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے سائیکل اٹھائی اور چل دیا۔ روز کا وہ راستہ اسے بہت خوبصورت لگا۔ پہلی بار اسے وہاں جا بجا جنگلی پھولوں کی موجودگی کا احساس ہوا اور گھاس کا فرش بہت اچھا لگا۔ اُس کے سر کے اوپر بہت قریب سے چہچہاتے ہوئے پرندے گزرے۔ سامنے جھاڑیوں میں سے ایک خرگوش نے سر اٹھا کر سائیکل کو آتے ہوئے دیکھا اور سر جھکا کر غائب ہو گیا۔ اوّل خان نے بلند آواز میں گانا شروع کر دیا۔ فارم پہنچ کر اُس نے سائیکل باڑے کی دیوار سے ٹکا کر کھڑی کی اور کام میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران بھی وہ گا رہا تھا۔ گیت مقامی ہی تھا لیکن اُس کا لہجہ افغانی تھا۔

مولانا عبدالرحیم کا گھر فارم کے قریب ہی تھا۔ اُن کے گھر کے برابر مسجد تھی' جس کے وہ پیش امام تھے۔ اوّل خان کے گانے کی آواز ہوا کے دوش پر ابھری اور دیوار سے گزرتی ہوئی کمرے میں پہنچی۔ مولانا بیدار ہو گئے۔

مولانا کا معمول تھا کہ فجر پڑھا کر آتے اور تلاوت کرنے کے بعد دوبارہ سو جاتے۔ ایسے میں اوّل خان کے گانے کی آواز مداخلتِ بے جا ہی تھی مگر مولانا نے کچھ ریاضت کے بعد اپنے تحت الشعور میں اس کے خلاف دیوارِ مزاحمت کھڑی کر لی تھی۔ اب عام طور پر وہ اس کے گانے کے باوجود سوتے رہتے تھے لیکن اس روز اُن کے تحت الشعور نے انہیں دھوکا دے دیا لیکن جاگتے ہی انہیں احساس ہو گیا کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ وہ کچھ دیر لیٹے چھت کو گھورتے رہے جو کافی اوپر تھی۔ اتنی اونچی چھت ہونے کی وجہ سے کمرا ٹھنڈا ہی رہتا تھا۔ وہ سوچتے اور متفکر ہوتے رہے۔ اب اتنے دن بعد معاملے کی اصلاح تو ممکن نہیں تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اس معاملے میں انہوں نے درست فیصلہ کیا ہے یا نہیں۔

مولانا کی اہلیہ بھی سوتی رہیں۔ مولانا بھی ہلے جُلے بغیر چھت سے زبانِ خاموشی میں سوال جواب کرتے رہے۔ انہیں احساس تھا کہ ان کی اہلیہ کو بھی ایک کڑا دن گزارنا ہے۔ اس لیے اُن کی نیند نہ خراب کرنا ہی بہتر ہے۔ بہرحال وہ جانتے تھے کہ بیگم کی سائیڈ مضبوط ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ عورتیں ایسے معاملات میں قابلِ اعتبار ہوتی ہیں مگر وہ اپنی سائیڈ سے فکرمند تھے۔

انہوں نے آنکھیں موند کر ایک سرد آہ بھری اور پھر تصور میں خود کو ایک پرچی کھولتے دیکھا۔ یہ منظر اب تک وہ سیکڑوں بار دُہرا چکے تھے۔ یہی منظر۔ بلکہ وہ پرچی ہی فساد کی جڑ تھی۔ وہ پرچی ان کے بیٹے مولا داد نے اٹھائی تھی اور ان کی طرف بڑھا دی تھی۔ یہی وہ مقام تھا' جہاں سے وہ صورتِ حال کو بار بار دُہراتے تھے مگر ابھی تک کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکے تھے۔ بات بہرحال پنچائیت سے شروع ہوئی تھی۔

O☆O

یومِ پاکستان کے سلسلے میں پنچوں کے ابتدائی اجلاس کامیاب رہے تھے۔ انہوں نے اچھی منصوبہ بندی کی تھی۔ میلے کا طے پایا تھا۔ ایک دنگل بھی ہونا تھا۔ چندہ جمع کرنے کی تجویزیں سب نے اتفاقِ رائے سے مان لی تھیں۔ یہاں تک بھی معاملات ٹھیک رہے تھے کہ میجر صاحب نے یادگاری درخت لگانے کی تجویز پیش کی تھی اور وہ بھی قبول کر لی گئی تھی۔ بس اس کے بعد بحث چھڑ گئی۔ پہلا سوال یہ تھا کہ کون سا درخت لگایا جائے لیکن وہ بھی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ بالآخر سب لوگ چنار کے درخت پر متفق ہو گئے تھے۔

مگر اگلی پنچائیت ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ سوال یہ تھا کہ پودا لگانے کا اعزاز کسے حاصل ہو۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ سب مل کر لگائیں مگر وہ فوراً ہی رد کر دی گئی کہ یہ پودے کے ساتھ ظلم ہو گا بلکہ ممکن ہے' پودا لگ ہی نہ سکے۔ پہلے ہی مر جائے۔

چنانچہ معززین پر نظر ڈالی گئی۔ نمبردار صاحب علاقے کے کونسلر بھی تھے۔ اُن کا کیس اور پروگرام طے تھا۔ مولانا نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ یہ اعزاز حاصل کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ میجر صاحب نے کمر کے درد کی وجہ سے معذرت کر لی۔ اس کے بعد جو نام تجویز کیے گئے' ان کی مخالفت کرنے والے بھی موجود تھے۔ اتفاقِ رائے کا کوئی امکان نہ رہا تو مولانا نے وہ تجویز پیش کی' جس پر وہ اب تک پچھتا رہے تھے اور فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ انہوں نے غلط کیا یا درست۔

"پنچو۔۔۔ ایک تجویز میرے ذہن میں آئی ہے۔" انہوں نے کہا تھا۔ "میرے پاس گاؤں کے لوگوں کی فہرست موجود ہے۔۔۔ وہ چندے والی۔ اس میں ہر گھر کے بڑے کا نام موجود ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ قرعہ اندازی کر لیتے ہیں۔ پرچیوں پر وہ نام لکھ دیے جائیں۔ آپ لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو میں ہی لکھ دوں گا۔ اگلی پنچائیت میں کسی معصوم بچے سے پرچی اٹھوا لیں گے۔ جس کے نام کی پرچی نکلے گی' پودا لگانے کا اعزاز اسی کا ہو گا۔ کہئے کیا خیال ہے پنچوں کا۔ انصاف کی بات ہے نا؟"

پنچوں نے تجویز پر غور کیا' کچھ اصولی اعتراض اٹھائے اور پھر

مان گئے۔

اگلی پنچایت میں قمبوار کے بیٹے ارشد نے ۲۵ پرچیاں بنائیں اور ہر پرچی پر ایک نام لکھا۔ فہرست کے مطابق گاؤں کے ہر گھر کے سربراہ کا نام۔ پھر اُس نے وہ پرچیاں بڑی صفائی سے تہ کر کے کاغذ کے ایک لفافے میں ڈال دیں۔ پھر پنچ نے لفافے کا منہ بند کر کے اسے بساط بھر ہلایا تاکہ تمام پرچیاں مکمل مل جائیں۔ یہاں تک کہ لفافہ پھٹنے کے قریب ہو گیا۔ اس کے بعد اس تقریب کی تمام تفصیلات طے کر لی گئیں۔

اسی وقت میجر صاحب کو مولانا کا بیٹا مولاداد... گھر کی طرف جاتا نظر آیا۔ انہوں نے آواز دے کر اُسے بلایا اور پنچوں سے بولے۔ "کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ چنانچہ لفافے کا منہ کھول کر پرچیوں کو بکھیر دیا گیا اور مولاداد سے کہا گیا کہ وہ کوئی ایک پرچی اٹھا لے۔

اتنی ساری پرچیاں دیکھ کر مولاداد بوکھلا گیا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اُس کا کوئی انعام نکلنے والا ہے۔ اور وہ اچھے سے اچھا انعام چاہتا تھا۔ وہ کبھی ایک پرچی کو ہاتھ لگاتا، کبھی دوسری کو مگر ہاتھ لگاتے ہی ہٹا لیتا۔ بلاشبہ ساتھ پرچیوں کو تو ہاتھ لگایا ہوگا اُس نے۔ بالآخر مولانا نے گرج کر کہا۔ "ابے۔۔ اٹھا کیوں نہیں لیتا کوئی ایک پرچی۔"

مولاداد نے گھبرا کے ایک پرچی اٹھائی اور مولانا کی طرف بڑھا دی۔

اُس وقت تک مولانا کو فکر تھی تو بس یہ کہ قمرا کا نام نہ نکل آئے کیوں کہ قمرا قادری سے چرس پیتا اور اپنی زوجہ کی مار کھاتا تھا یا پھر انور علی کا نام نہ نکل آئے۔ بڑے میاں چلنے پھرنے کے تو قابل نہیں پودا کیا لگائیں گے۔

انہوں نے کاغذ کی تہیں کھولیں۔ نام کے پہلے حصے کو دیکھتے ہی اُن کے دیوتا کوچ کر گئے۔ وہ جانتے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ دوسری طرف متوقع نظریں اُن سے سوال کر رہی تھیں۔ وہ اُن سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے تھے چنانچہ انہوں نے بہ آوازِ بلند وہ نام پڑھا۔

"اوّل خان۔"

پہلے تو سناٹا چھا گیا۔ آخر کار اصغر نے زیرِ لب کہا "وہ۔۔۔ وہ تو افغانی ہے۔"

○☆○

مولانا نے بے رخی سے اپنا تجزیہ کرنے کے خیال سے چھت سے نظریں ہٹائیں اور پلنگ کی پائنتی پر جما دیں۔ انہوں نے سوچا، اصغر کے سوا کسی اور نے آواز اٹھائی ہوتی تو کیا ہوتا۔

اُن کی اور اصغر کی تو بنتی ہی نہیں تھی۔ اصغر نماز کے بعد ہمیشہ درود و سلام سے پہلے اٹھ کر چلا جاتا تھا۔ یعنی وہابی تھا۔ دوسری طرف وہ انہیں حلوے مانڈے والا مولوی کہتا تھا۔ مولانا نے اُسے ایک بار بٹھا کر سمجھایا تھا کہ بھئی اگر کوئی میرے گھر ختم کا کھانا یا حلوہ بھیج دیتا ہے تو کیا میں انکار کر کے دل آزاری اور کفرانِ نعمت جیسے گناہوں کا ارتکاب کروں۔ اللہ کو ناراض کروں۔ مگر وہ اتنا سنتے ہی اٹھ کر ہنستا ہوا چلا گیا تھا۔ مولانا خود اُس سے الجھنے سے گریز کرتے تھے مگر وہ موقع بے موقع الجھتا رہتا تھا۔ وہ آئے دن ان پر الزامات عائد کرتا رہتا تھا۔

اب مولانا خود سے پوچھ رہے تھے کہ اگر یہ نکتہ اصغر کے بجائے میجر صاحب، نوردین یا مراثی نے اٹھایا ہوتا تو وہ کیا جواب دیتے۔ اب یہ محض قیاس کے گھوڑے دوڑانا ہی تھا۔ وہ خود کو اس سوال کا درست جواب نہیں دے پا رہے تھے۔

بہرحال اُس روز اصغر کے اعتراض پر انہوں نے کہا تھا۔

"اصغر میاں۔ ہم سب اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ گاؤں کے ہر گھر سے ایک نام لیا جائے گا۔"

"لیکن یہ یومِ پاکستان ہے۔ ہمارا دن۔" اصغر نے تنتنے مچلا کر کہا تھا۔

مولانا نے دل میں سوچا کہ بات تو خدا لگتی ہے لیکن وہ اپنے کینے دشمن کی بات کو سراہ تو نہیں سکتے تھے چنانچہ دھیمے لہجے میں بولے۔ "پنچوں کی کیا رائے ہے بیچ اس مسئلے کے، جو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

نوردین کی چند روز پہلے اصغر سے تُو تکار ہو چکی تھی۔ اصغر کا کتا اُن کی دو مرغیاں دبوچ لے گیا تھا لیکن اس واقعے کا کوئی عینی شاہد نہیں تھا۔ اس نے اصغر سے شکایت کی تو اصغر نے کہا کہ اس کا کتا تو ایک ہفتے سے گھر سے باہر نہیں نکلا ہے۔ نوردین کو اپنی وہ مرغیاں بہت عزیز تھیں اور اُسے آج تک اُن کا غم تھا۔

"اوّل خان کو یہاں رہتے ۳۰ سال ہو چکے ہیں۔" نوردین بولا۔ "مجھے تو اب وہ ہم ہی میں سے لگتا ہے۔ اس نے برابر والے گاؤں کی لڑکی سے شادی کی ہے، جس سے اُس کے دو بچے بھی ہیں۔ مجھے یہ اعتراض اُس کے ساتھ زیادتی لگتا ہے۔"

"یہ بات درست ہے۔" حسین بخش نے کہا۔ لیکن اس کے لہجے میں زور نہیں تھا۔ اوّل خان کے بچوں کے نام تو پاکستانی تھے لیکن دیکھنے میں وہ افغان لگتے تھے۔

لیکن اصغر اپنے موقف سے ہٹنے پر تیار نہیں تھا۔ "اوّل خان کے بچوں کو میں پاکستانی مانتا ہوں لیکن اوّل خان تو پاکستانی نہیں ہے۔"

"کیسی بچوں والی بات کرتے ہو۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اوّل خان نے پاکستانی قومیت کے لیے درخواست دی ہوئی ہے۔" مولانا بولے۔ "بے انصافی کی بات نہیں کرنی چاہیے۔ یوں تو قمروز بھی ایرانی ہے، پاکستانی نہیں۔"

"اس سے مجھے کب انکار ہے لیکن مجھے یاد ہے کہ ایران نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا اور افغانستان نے ہمیشہ ہماری مخالفت کی۔" اصغر نے سیاسی دلیل دی۔

"یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔" میرالی نے کہا۔

بجر نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ سب لوگ اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بجر نے کچھ دیر سسپنس پیدا کرنے کے بعد کہا۔ "یہ بات تو پہلے سوچنے کی تھی۔ ہم سب قرعہ اندازی پر متفق ہوئے تھے تو پلیز اوزا پلیز۔"

"لیکن ہماری ملکی تقریب ہے۔ اور پودا لگانے کا اعزاز ایک غیر ملکی کو۔ یہ تو مذاق معلوم ہوتا ہے۔" اصغر بولا۔

"یہ بات ٹھیک ہے۔" دلاور نے تائید کی۔

بحث چھڑ گئی۔ بجر اور مولانا اصول پر ڈٹ گئے۔ نوردین اوّل خان کی طرف سے بول رہا تھا۔ اصغر، میرالی اور دلاور اس کے خلاف تھے۔ گھنٹوں ہو گئے۔ مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ دونوں فریق اپنے اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔ مولانا اور بجر کے پاس تو وقت کی کمی تھی نہیں۔ مخالف پارٹی کو اپنے اپنے کام دھندے کی فکر تھی۔ چنانچہ انہی کے کہنے پر پنچائیت ختم ہوئی۔ وہ لوگ بڑبڑاتے ہوئے اپنے راستے گئے۔

لیکن دو دن میں اندازہ ہو گیا کہ پورا گاؤں اس سلسلے میں منقسم ہو چکا ہے۔ مولانا کو افسوس تو ہوا کہ یہ خواہ مخواہ کا تنازعہ کھڑا ہو گیا ہے لیکن انہیں خوشی بھی تھی کہ وہ اصول پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

اگلے روز انہوں نے فارم سے اوّل خان کو بلا کر اُسے بھی بتا دیا۔ اسے سمجھانا بھی کارے دارد تھا۔ اوّل خان بہت توجہ سے ان کی بات سنتا رہا۔ مولانا کی صاف ستھری اردو اس کی سمجھ میں مشکل سے ہی آتی تھی۔ بہرحال وہ سمجھ ہی گیا۔

"آپ چاہتے ہیں کہ میں پودا لگاؤں؟" اُس نے پوچھا۔

"تمہارے نام کی پرچی نکلی ہے۔" مولانا نے بتایا۔

لیکن یہ معاملہ اوّل خان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ چنانچہ مولانا نے اُسے قرعہ اندازی کا مکمل فلسفہ سمجھایا۔ کچھ اُس کی سمجھ میں آیا، کچھ نہیں آیا۔ بہرحال وہ خوش بہت ہوا۔ اُس نے اپنی سائیکل اٹھائی، اچھل کر اُس پر بیٹھا اور گاتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔ اُسے بیوی کو خوش خبری سنانی تھی۔

O☆O

مولانا سرائے کا رخ کبھی نہیں کرتے تھے لیکن سرائے کے مالک انصار کی وہ بڑی عزت کرتے تھے اس لیے کہ وہ پنج وقتہ نمازی تھا۔

مولانا نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔ "انصار۔۔۔ یومِ پاکستان کے سلسلے میں گاؤں والوں کا رویہ کیا ہے؟"

"آپ شاید پودا لگانے کی تقریب کے متعلق پوچھ رہے ہیں؟"

مولانا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "میرا اشارہ اوّل خان والے معاملے کی طرف ہے۔"

"کچھ اُس کے حق میں ہیں کچھ اُس کے خلاف ہیں۔"

"خلاف کون کون ہیں؟" مولانا نے پوچھا۔

"سب سے زیادہ خلاف تو اصغر ہے پھر دلاور ہے۔ اس کا بھائی برسوں پہلے افغانستان میں مارا گیا تھا۔ دو تین افراد اور ہیں لیکن وہ مسئلے کو اتنی زیادہ اہمیت بھی نہیں دے رہے ہیں۔ بس وہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ حق کسی مقامی آدمی کا تھا اور ہاں۔۔۔ اوّل خان کی برائی کوئی بھی نہیں کرتا۔ اصغر اور دلاور بھی نہیں کرتے۔ بات بس اصول کی ہے۔"

"اچھا۔ یہ تو ہے؟" مولانا نے آہ بھر کر کہا۔ وہ جانتے تھے کہ اختلاف صرف اصول کی بنیاد پر ہوگا۔ ورنہ ایک انسان کی حیثیت سے اوّل خان نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی تھی جب کہ حالات اس کے لیے کسی اعتبار سے بھی موافق نہیں تھے۔ گاؤں والے افغانیوں سے بیزار تھے۔ ان کے خیال میں افغان لوگ سست، گندے، غصہ ور، جھگڑالو اور ناقابلِ اعتبار تھے۔ اوّل خان پہلے پہل گاؤں آیا تو سب نے اسے ناپسندیدگی سے دیکھا۔ سب کی نگاہوں میں شک تھا۔ سوائے گاؤں کی لڑکیوں کے۔ وہ آتے ہی سب لڑکیوں کے دل کی آرزو بن گیا تھا۔

پھر لوگوں نے بڑی بے یقینی سے۔۔۔ اور تعجب سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اوّل خان ایسا نہیں ہے۔ فارم والے اسلم شاہ کا کہنا تھا کہ اسے آج تک اتنا محنتی اور ایماندار ملازم نہیں ملا تھا۔ اور یہ حقیقت تھی کہ اوّل خان بڑی محنت، مستعدی اور خوش دلی سے کام کرتا تھا۔ وہ فارم میں ہی رہتا تھا۔ وہاں کی صفائی ستھرائی قابلِ دید تھی۔ وہ بچوں سے محبت کرتا تھا۔ لہٰذا اسلم شاہ کی غیر موجودگی میں گاؤں بھر کے بچے وہاں جمع رہتے تھے۔

کچھ عرصے میں اس نے خاصی رقم جمع کر لی۔ اسلم شاہ نے اسے تھوڑی سی زمین دے دی۔ اس نے اپنا مکان بنا لیا پھر اُسے شادی کی فکر ہوئی۔ اُس نے مولانا کو ہی بیچ میں ڈالا۔ اُس وقت تک وہ گاؤں والوں کا اعتبار حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ خیالو سے اُس کی شادی ہو گئی۔

اُس نے اپنے گھر کے سامنے بڑی محنت سے باغیچہ بنایا۔ اس میں سبزیاں لگائیں۔۔۔ وہ کبھی خالی نہیں بیٹھتا تھا، کچھ نہ کچھ کرتا رہتا۔

پھر اُس کے ہاں پہلا بچہ ہوا۔ تین سال بعد دوسرا بچہ بھی آ گیا۔ اوّل خان کو بچوں سے عشق تھا۔ وہ خیالو سے بڑھ کر اُن کا خیال رکھتا۔ انہیں نہلاتا، دھلاتا، کھلاتا اور رات کو گانے گا گا کر انہیں سلاتا۔ وہ کبھی ایسی ویسی صحبت میں نہیں پڑا۔ کہا جاتا تھا کہ خیالو گاؤں کی سب سے خوش قسمت لڑکی ہے۔

اوّل خان کو اپنے گھر سے دلچسپی تھی۔ وہ باہر کم ہی نکلتا تھا۔ اس لیے اُسے یہ پتا نہیں چلا کہ گاؤں میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ اور اگر اس نے آتے جاتے کچھ سنا بھی تو وہ اس کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ اس کی بیوی کو معلوم تھا لیکن اس نے اسے کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس اعزاز پر تو اوّل خان کی معصوم خوشی ایسی

تھی جیسے اسے سربراہ مملکت منتخب کرلیا گیا ہو۔

بٹنے کی رسم کے بعد اوّل خان اپنی سائیکل پر بیٹھ کر شہر گیا جو آٹھ میل دور تھا۔ وہاں سے اس نے اپنے بچوں کے اور خیالو کے لیے نئے کپڑے خریدے۔ اس نے گاؤں کو نہلا دُھلا کر چمکایا۔ باڑے کے دونوں دروازوں پر اس نے پاکستانی جھنڈے لگائے۔ وہ قوم پرستی کا مطلب پوری طرح نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پورے گاؤں نے متفقہ طور پر اسے اپنی نمائندگی کے لیے چُنا ہے۔ یہ عمل ان کی طرف سے مکمل قبولیت کا اشارہ ہے اور وہ عزت افزائی ہے، جس کا صلہ وہ انہیں کبھی نہیں دے سکے گا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے پاکستانی قومیت کی سند دے دی گئی ہے۔

جیسے جیسے چودہ اگست قریب آرہی تھی، اس کی پہلے سے بات دار آواز جان پکڑتی جا رہی تھی۔ اس کے نتیجے میں مولانا کا تحت الشعور تک بیدار ہو جاتا۔ مولانا اپنی اہلیہ پر چڑچڑانے ۔۔۔ بات بے بات لڑنے لگے۔ ایک دن وہ خیالو پر چڑھ دوڑے کہ وہ اسے سمجھاتی کیوں نہیں۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ وہ اوّل خان کے حامی ہیں۔

"اس سے کہو، کبھی بھولے بھٹکے نماز بھی پڑھ لیا کرے۔" انہوں نے خیالو سے کہا۔ "اور یہ وہ گا کیا رہا ہے؟"

"وہ پاکستانی بننے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔" خیالو نے جواب دیا۔ "دل دل پاکستان گاتا ہے۔"

مولانا حیران رہ گئے "اپنی زبان میں ترجمہ کرکے گاتا ہوگا۔"

"جی نہیں۔ اپنی دانست میں تو وہ ہماری ہی زبان میں گاتا ہے۔"

"اب یہ معمول ہو گیا کہ مولانا رات کو سوتے وقت کلمہ پڑھتے، پھر سورۃ تو بھرتے اور اس کے بعد بڑے خشوع و خضوع سے اپنے دونوں کانوں میں روئی ٹھونس لیتے۔

○☆○

۱۴ اگست کی صبح مولانا ناشتا کرکے بیٹھے ہی تھے کہ ان کے کانوں میں اصغر کی چیختی ہوئی آواز آئی۔ وہ غیر ملکیوں کے متعلق کچھ کہہ رہا تھا، پھر ایک تائیدی کورس سنائی دیا۔ مولانا فکرمند ہو گئے مگر پھر انہوں نے خود کو یہ سوچ کر دلاسا دیا کہ جذباتیت دریا نہیں ہوتی۔ سرائے میں بیٹھ کر جذباتی تقریر کرنا اور بات ہے اور ایک قومی دن کا احترام اور بات۔ انہوں نے خود کو یقین دلایا کہ وہ لوگ یومِ پاکستان پر ہنگامہ بہرحال نہیں کریں گے۔

مگر انہیں یہ فکر بھی تھی کہ باڑے میں کام کرتے ہوئے اوّل خان تک بھی یہ آوازیں پہنچ رہی ہوں گی۔

دوسری طرف اوّل خان بے فکری سے دل دل پاکستان گا رہا تھا۔ پھر مولانا نے اوّل خان کو گایوں کو چراگاہ کی طرف لے جاتے سنا۔ تب کہیں ان کی پریشانی میں کچھ کمی ہوئی۔

ٹھیک آٹھ بج کر تین منٹ پر جیسے پوری کائنات ٹھہر گئی۔ کہیں کوئی تحرک نہیں تھا پھر فضا میں ایک لے ابھری ۔۔۔ پاک سرزمین شاد باد۔ اور لگتا تھا، یہ آواز زمین سے پھوٹ رہی ہے، آسمان سے برس رہی ہے، شجر حجر گا رہے ہیں۔

اوّل خان سائیکل پر بیٹھ کر گھر واپس آیا۔ اس نے چھوٹے بچے کو اپنے گھٹنے پر بٹھا کر زوردار ناشتا کیا پھر اپنے باغیچے میں جا کر اس نے سرخ سفید اور نیلے پھول توڑ کر اُن کا خوبصورت گلدستہ بنایا۔ وہ گل دستے بنا کر اس نے اپنے چھوٹے بچے کے پرام کے دونوں طرف لگائے۔ درمیان میں پاکستان کا چھوٹا سا جھنڈا تھا۔

اس کے بعد اس نے بڑے اہتمام سے غسل کیا اور شیو بنایا۔ تقریب کا وقت دوپہر کا تھا۔ مولانا نے اسے سارے آداب سکھا دیے تھے۔ وہ ان کی ریہرسل میں مصروف ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ گا بھی رہا تھا۔ ایسی زمیں اور آسماں۔ ان کے سوا جانا کہاں ۔۔۔ اور یہ دوسری لائن گاتے وقت اس کے لہجے میں نجانے کہاں سے بیکراں یقین آجاتا تھا۔

اُدھر خیالو نے بچوں کے کپڑے بدلوائے۔ بڑا بیٹا کاشف چیخ رہا تھا۔ "اماں ۔۔۔ میرا جھنڈا کہاں ہے؟"

اوّل خان نے بیٹے کی آواز سنی تو بے حد فخر سے سوچا ۔۔۔ میرے بیٹے کی آواز گاؤں کے کسی بھی بچے سے مختلف تو نہیں۔

○☆○

اوّل خان اور خیالو اپنے بچوں کے ساتھ بڑی شان سے میدان میں پہنچے۔ چھوٹے بچے کا گلدستوں اور پرچم سے سجا پرام گاؤں والوں کے لیے بالکل نئی چیز تھا۔ اوّل خان نے اس کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ اس وقت تک گاؤں کے بیشتر لوگ میدان میں پہنچ چکے تھے۔ اوّل خان نے ماہر فن مہمانِ خصوصی کی طرح اپنی آمد کے وقت کا بطورِ خاص خیال رکھا تھا۔

میدان میں ایک چھوٹا شامیانہ لگا دیا گیا تھا لیکن زیادہ تر لوگ میدان میں ہی کھڑے تھے۔ ایک طرف پرچم کشائی کا سامان تھا۔ دوسری طرف مجر صاحب ایک تازہ کھدے ہوئے گڑھے کے سامنے بیلچہ لیے کھڑے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں پودا لگایا جانا تھا۔

مولانا عبدالرحیم بہت پریشان نظر آرہے تھے۔

اصغر اور دلاور تماشائیوں کے دائرے میں سب سے آگے کھڑے تھے۔ اُن کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

اوّل خان نے اپنی بیوی اور بچوں کو عورتوں میں پہنچایا، جہاں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا پھر وہ مولانا کی طرف آیا۔ وہ لوگوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ مسکرایا کیا، اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ تماشائی بے حسی سے اسے دیکھتے رہے۔ انداز ان دیہاتیوں کا سا تھا جو نظروں ہی نظروں میں کسی گھوڑے کو تول رہے ہوں۔ مقامی لباس میں ہونے کے باوجود اوّل خان ہر زاویے سے، اپنے ہر انداز سے، ہر اعتبار سے، انہیں افغان ہی لگ رہا تھا۔

دلاور کے حلق سے غراہٹ سے مشابہ آواز نکلی اور مولانا

حوا الرجیم گھبرا کر آسمان کو دیکھنے لگے، جیسے خدا سے مدد طلب کر رہے ہوں۔

اسی لمحے تماشائیوں کی دوسری قطار میں ہلچل پیدا ہوئی۔ قطار پھٹی۔ ہر سر اُسی طرف گھوما۔ باہر ایک بہت بڑی چمکتی کار آ کے رکی۔ وہ نیلے رنگ کی کار تھی۔ سفارت خانے کی نمبر پلیٹ تھی۔ شاید وہ اِدھر سے گزر رہے تھے۔ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد کار کے دروازے کھولے گئے۔ کار میں سے دو غیر ملکی اترے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ دونوں انگریز تھے۔

تمام گاؤں والے انھیں گھور رہے تھے۔ وہ دونوں ادھیڑ عمر تھے اور اُن کے بدن ایک دم فربہ تھے۔ مرد گہرے گرے کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ عورت نیلے اسکرٹ اور سرخ بلاؤز میں تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ہیرے کے کنگن تھے۔ سر پر ہیٹ تھا، جس میں ایک خوبصورت پر لگا تھا۔

ان دونوں نے تماشائیوں کے پار غور سے وہ منظر دیکھا۔ پھر اس نے اپنے شوہر سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔ "شان دار۔۔۔ کب شورت۔۔۔"

گاؤں والوں نے بے چینی سے پہلو بدلے۔ میجر نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ مولانا نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "بھائیو اور بہنو۔ اس ملی تقریب کا آغاز ہم خدائے کریم کے بابرکت کلام سے کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے تلاوت شروع کر دی۔ تلاوت کے بعد انھوں نے اعلان کیا۔ "پہلے پرچم کشائی ہو گی۔ اس کے لیے تشریف لاتے ہیں میجر جلیل۔"

میجر جلیل نے تالیوں کی گونج میں پرچم لہرا دیا۔

"اور اب اوّل خان ۱۴ اگست کا یادگار پودا لگائیں گے۔" مولانا نے اعلان کیا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہر چہرے پر تاثر تھا لیکن اصغر اور دلاور کے چہرے تمتما رہے تھے۔ پھر ان کی نظریں اوّل خان کے چہرے پر رکیں۔ وہ اس مجمع میں واحد شخص تھا جسے کچھ لوگوں کے معاندانہ جذبات کا علم نہیں تھا۔ وہ سر اونچا کیے کھڑا تھا۔ وہ غیر ملکیوں کی آمد سے بھی بے خبر تھا۔

اعلان سنتے ہی وہ مسکرایا۔ اُس کے سفید ہموار دانت چمک اٹھے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر گڑھے کی طرف دیکھا، جس کے پہلو میں چنار کا چھوٹا سا پودا رکھا تھا۔ پھر وہ نپے تلے قدم اٹھاتا گڑھے کی طرف بڑھا۔ وہاں اکڑوں بیٹھتے ہوئے اس نے گڑھے میں جھانکا۔ ایک طرف ملی جلی کھاد کا ڈھیر تھا جو پودا لگانے سے پہلے گڑھے میں ڈالی جاتی تھی۔ اوّل خان کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا۔

میجر نے بیزار ہونے کے سے انداز میں کہا۔ "چلو۔۔۔ اب شروع کرو۔"

انگریز جوڑا تماشائیوں کے درمیان سے گزرتا اب سب سے آگے پہنچ چکا تھا۔ "کب شورت۔۔۔" عورت نے پھر کہا۔

اصغر کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

انگریز عورت نے جو اصغر کے برابر آ کھڑی ہوئی تھی، اصغر سے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟" ساتھ ہی اُس نے انگلی سے اوّل خان کی طرف اشارہ کیا۔

پورا گاؤں گوش بر آواز ہو گیا تھا لیکن اصغر کا جواب کوئی نہ سن سکا۔

"یہ تو پاکستانی نہیں لگتا۔" عورت پھر بولی۔ "تم لوگ اپنا بیٹل اسے پر فورینرز کو عزت دینا۔ ویری نائس۔ تم نے ہمیں۔"

گڑھے میں کھاد ملی مٹی ڈالتے ہوئے اوّل خان نے سر اٹھا کر عورت کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر زلزلے کا تاثر تھا پھر اس نے اردگرد کھڑے لوگوں کے بے مروت چہروں کو دیکھا۔ اس جانور کی طرح جسے کرتب دکھانے پر داد دینے کے بجائے لات مار دی گئی ہو۔ مولانا نے میجر کی طرف دیکھا اور اوّل خان کی طرف بڑھے۔

مگر اُن کی مداخلت سے پہلے اصغر بلند آواز میں بول پڑا۔ "میڈم۔۔۔ یہ اوّل خان کوئی فورینر نہیں، ہمارا اپنا ہے۔ ہمارے گاؤں میں رہتا ہے۔ یہ ہم ہی میں سے ہے۔" پھر اس کے لہجے میں نفرت امنڈ آئی۔ "فورینرز وہ لوگ ہوتے ہیں جو باہر سے آتے ہیں اور ہمارے معاملات میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔" پھر وہ دلاور کا ہاتھ تھام کر اوّل خان کی طرف بڑھا اور اس کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "شاباش ہمارے پاکستانی بھائی، پودا لگاؤ۔"

اسی لمحے اوّل خان کے داہنے ہاتھ میں چمکتا تیز دھار والا چاقو نظر آیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا، اس نے چاقو سے اپنی بائیں ہتھیلی پر چرکا لگایا اور ہتھیلی کا رخ گڑھے کی طرف کر دیا پھر اُس نے پاٹ دار آواز میں گانا شروع کر دیا۔ "ایسی زمیں اور آسماں۔ ان کے سوا جانا کہاں۔ بڑھتی رہے یہ روشنی۔ چلتا رہے یہ کارواں۔ دل دل پاکستان۔ جان جان پاکستان۔" وہ اپنے مخصوص افغان لہجے میں گا رہا تھا۔

سب گھورے اُسے دیکھتے رہے پھر سب سے پہلے اصغر ہی کو ہوش آیا۔ اُس نے جیب سے رومال نکالا اور اوّل خان کا ہاتھ کھینچ کر رومال کس کر باندھ دیا۔

اُسی وقت خاموشی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ لوگوں نے تالیاں بجانا شروع کیں تو جیسے زمین آسمان ہل گئے۔ پھر گاؤں کا ہر شخص اوّل خان کی آواز میں آواز ملا کر گانے لگا۔۔۔ دل دل پاکستان، جان جان پاکستان۔۔۔ لیکن افغان لہجے والی وہ آواز سب کی مشترکہ آوازوں پر حاوی تھی۔

دل دل پاکستان گاتے گاتے اوّل خان نے چنار کا پودا گڑھے میں اپنے خون پر کھڑا کیا اور دوسرے ہاتھ سے گڑھے کو بھرنے لگا۔ پورا گاؤں تالیوں کی لے پر جوش و خروش سے گا رہا تھا۔۔۔ دل دل سے ملتے ہیں تو پیار کا چھونا ہے۔۔۔ چھونا ہے۔۔۔"

"ہاؤ چارمنگ، ہنی، ہاؤ بیوٹی فل۔" انگریز عورت اپنے ساتھی سے کہہ رہی تھی۔ "ہاؤ ڈیلائٹ فل ڈیئر۔"